مفکر احرار چودھری افضل حقؒ

تلخیص: عبدالمجید قریشی

قسط نمبر ۲

میرا افسانہ

سب انسپکٹر انچارج، متعدد ڈکیتیوں کی تفتیش پر لگے ہوئے۔ کئی ماہ کے بعد تھانے آئے اور اُسی روز تھانہ پھلور کے علاقے میں روانہ ہو گئے۔ وہ گرانڈیل جوان تھے، لیکن ذرا پیٹ بڑھا ہوا تھا۔ شام کے قریب ایک ٹم ٹم پر سوار ہو کر واپس لوٹے۔ اُنہیں مہاجن سمجھ کر ڈاکوؤں کا گروہ اچانک حملہ آور ہوا۔ ایک ڈاکو نے حوصلے سے آگے بڑھ کر بندوق ہاتھ سے چھیننا چاہی۔ دونوں میں کش مکش جاری ہو گئی۔ باقیوں نے لاٹھیوں سے حملہ کر دیا۔ ایک سپاہی اور ہیڈ کانسٹیبل ہمراہ تھے۔ وہ تو گرم سرد دیکھ کر بھاگ نکلے۔ سب انسپکٹر مردِ خداخم ٹھونک کر کھڑا ہو گیا۔ ایک ڈاکو بندوق کی نالی کے سامنے آ کر سر پر ضرب کاری لگانا چاہتا تھا کہ سب انسپکٹر نے بندوق چلا دی، چھرے سینے کو چھلنی کر گئے۔ وہ لوٹنی کھا کر گرا، پھر سنبھلا اور جھاڑیوں میں غائب ہو گیا۔ اُس کے باقی ساتھیوں نے بندوق لاٹھیوں سے ناکارہ کر دی۔ سب انسپکٹر نے اُن میں سے ایک لاٹھی چھین کر بہادرانہ مقابلہ کیا۔ جس کو اُس کی ایک لاٹھی لگ گئی، کاری ہوئی، اگرچہ سب انسپکٹر کے مقابلے میں گبرو جوان تھے، مگر وہ بھی پنجاب پولیس میں فرد تھا۔ اُس دیو ہیکل کو دیکھ کر ڈاکوؤں نے یقین کر لیا کہ وہ کسی جن کے قابو میں آ گئے ہیں، اس لیے جان بچانا فرض خیال کر کے سر پر پاؤں رکھ کر بھاگے۔

ہیڈ کانسٹیبل اور کانسٹیبل موقع مناسب دیکھ کر آ گئے۔ اتنے میں جھاڑیوں میں کسی کے کراہنے کی آواز سن کر اُدھر متوجہ ہوئے تو بندوق سے مجروح ڈاکو کو جاں بلب پایا۔ جُوں تُوں کر کے اسے اٹھایا، لیکن وہ تھانے پہنچنے سے پہلے اعمال کی جواب دہی کے لیے خدا کے حضور میں چلا گیا۔ مستوفی کے لباس اور جوتے سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ لاہور اور منٹگمری کے درمیانی علاقے کا باشندہ ہے۔ اگرچہ عملہ مقدمے کی کامیابی سے مایوس تھا، لیکن میں پُر امید تھا میں نے اس لاش کو تمام تھانوں میں جا کر تحقیقات کی۔ چند روز کے بعد تھانہ قصور کا سب انسپکٹر ایک شخص کو ہمراہ لایا لاش زنانہ ہسپتال لدھیانہ میں محفوظ تھی۔ سب انسپکٹر کے ہمراہی نے کہا کہ یہ میرے بھائی کی لاش ہے جس کے متعلق اس کے ساتھیوں نے بیان کیا تھا کہ کسی دیو نے اسے مار ڈالا ہے، چنانچہ لاہور پولیس سے مل کر یہ تجویز ہوئی کہ بوقتِ وقت مستوفی کے ہمراہیوں کو گرفتار کیا جائے۔ غرض ۲۰ کانسٹیبل ۴ ہیڈ کانسٹیبل اور دو سب انسپکٹر ایک گروپ بن کر سر شام دیہات کو روانہ ہو گئے۔

مجھے اور ضلع لاہور کے ایک سب انسپکٹر کو جو علاقے سے بخوبی واقف تھا، ایک سمت روانہ کر دیا گیا۔ ہمیں ہدایت ہوئی کہ جہاں تک ہو سکے، بکھے نامی شخص کو گرفتار کیا جائے، لیکن ملزم خطرناک ہے، ہر طرح ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے! اس سے بھی اہم کام جس پر ہمیں مامور کیا گیا، وہ یہ تھا کہ مستوفی کے گھر کی تلاشی لے کر مشتبہ اشیاء کو فوراً قبضے میں کر لیں اور صبح دس بجے سے قبل واپس قصور لوٹ آئیں۔

ہم نے سب سے پہلے بکھے کے گاؤں کا رخ کیا۔ کچھ رات گئے گاؤں میں داخل ہو گئے اور ایک وسیع صحن کے

مکان کا جا محاصرہ کیا۔ بہت سے آدمیوں کے پاؤں کے آہٹ سن کر ایک عورت اندر سے نکلی۔ چاند ابھر آیا تھا۔ عورت کیا نکلی ماہتاب ماند پڑ گیا۔ لباس سادہ مگر اداء رنگین۔ اس نے سب انسپکٹر کو پہچان کر ہمدم دیرینہ کی طرح خیر مقدم کیا۔

سب انسپکٹر بھی شمع پر پروانے کی طرح گرا جا رہا تھا مجھے ان کے راز و نیاز بے محل معلوم ہوئے۔ تفتیش میں عشق بازی کا وقت نہ تھا، لیکن علاقے سے ناواقف ہونے کے باعث خاموش تماشائی بنا رہا۔ وہ صدقے قربان کھتی ہوئی اندر لے گئی۔ دیا جلایا، تو وہاں ایک اور قندیل روشن تھی۔ ایک اور چند سے ماہتاب نوجوان لڑکی سلک کا لباس پہنے ابھی خواب جوانی سے اچانک اٹھی تھی۔ اس کی آنکھوں میں نیند کا خمار تھا جسے دیکھ کر دماغ میں نشہ اور طبیعت میں سرور پیدا ہوتا تھا۔ یہ بچھے بدمعاش کی ماں اور بہن تھیں۔ لڑکی پولیس کی آمد سے مطلق ہراساں نہ تھی، بلکہ مسرت اس کے لبوں پر کھیلتی تھی اور وہ مسکرا کر باغ و بہار پیدا کر رہی تھی۔ آخر وہ قتالۂ عالم محشر بپا کرتی اٹھی کوٹھڑی میں سے نیا بستر اٹھا کر لائی اور ایک پلنگ پر بچھا کر میرے بیٹھنے کے انتظار میں خود کھڑی رہی۔ ایک ہیڈ کانسٹیبل نے میرا بازو پکڑ کر پلنگ پر بٹھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا کہ کسی کی منت مان لیں۔ اس پر وہ مسکرا دی۔ مجھ پر اوس پڑ گئی۔ ایسی آفت جاں کا پہلی دفعہ سامنا ہوا تھا۔ میں گرم سرد چشیدہ نہ تھا۔ سب انسپکٹر کو تو ہر فن مولا ہونا چاہیے تھا، لیکن میں مکتب عشق کا ابجد خواں بھی نہ تھا۔ اس لیے محجاب ماب دوشیزہ کی طرح گردن جھکا کر بیٹھ گیا۔

ایک ہیڈ کانسٹیبل زیر کو یوں زیر دیکھ کر بات کرنے کے بہانے مجھے وہاں سے اٹھا کر باہر لے گیا اور کہنے لگا: بچھے کی ماں سو کھیتیاں کھا کر آئی ہوئی رام گئو ہے۔ جو اس سے دودھ چاہتا ہے، وہ خون دے کر جاتا ہے۔ یہاں شب باش ہونا قرینِ دانش نہیں۔ دو سب انسپکٹروں کے قتل کے الزام سے بری ہو چکی ہے۔ ایسا نہ ہو کہ کوئی تیر یا جلتر چل جائے!"

میں نے دوسرے سب انسپکٹر کو الگ بُلا کر سمجھایا کہ حُسن کی ارزانی دیکھ کر قیمتی جان جوکھوں میں ڈالنا ٹھیک نہیں۔ اس نے پلٹ کر ان قتالہ اور آتش کی پرکالہ، ماں بیٹی کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں ان کے گھر شب باش ہونے کی التجا تھی۔ سب انسپکٹر نے ان کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے اور مجھ سے کہا کہ رات گزر رہی ہے، جوانی میں کامرانی کی ایسی راتیں کب ملتی ہیں۔

اس کی یہ بے باک گفتگو سن کر میں روایتی بزدل کی طرح بالکل بد حواس ہو گیا۔ ادھر ادھر دیکھ کر اطمینان کرنے لگا کہ کوئی سنتا تو نہیں ہے۔ یہاں نگاہ کو دعوت نظارہ دے کر چھپ جانے والے محبوب سے سابقہ نہ تھا، بلکہ عزت کو بازاری جنس سمجھ کر فروخت کرنے والے سے معاملہ تھا۔ میرا ساتھی سب انسپکٹر آبرو کی سوداگری میں مصروف ہو گیا اور میں مستوفی کی خانہ تلاشی کے لیے چلا آیا۔

اصرار اور تکرار میں عجب کرامات ہے۔ نادہندہ سے بھی ڈوبی ہوئی رقم مل جاتی ہے، مر جانے والا مان جاتا ہے۔ بات چھپانے والا بتا دیتا ہے۔ میں نے یہ نسخہ تفتیش جرائم میں آزمایا اور اسے ہمیشہ تیر بہدف پایا۔ چالاک سے چالاک ملزم کو علیحدہ بٹھا کر یہی سوال کرتا اور کرواتا کہ بھئی ٹھیک ٹھیک بتا دو۔ ہر سوال پر ملزم لاعلمی کا اظہار کرتا

اور میں اور شد و مد سے وہی سوال برابر دہراتا۔ خود تھک جاتا، تو ہیڈ کانسٹیبل کو اسی سوال کو مختلف لفظوں میں دہرانے پر لگا دیتا۔ تا آنکہ دو گھنٹوں کے اندر اندر ملزم دماغی کوفت محسوس کرنے لگتا اور جھنجھلا کر انکار کرتا۔ یہ بحران کا وقت ہوتا ہے، اس موقع پر جلد جلد سوال مختلف طریقوں سے دہرانا چاہیے: "بتا دو بھئی! سچ سچ بتا دو، اچھا کچھ تو کہو، بھئی ٹھیک ٹھیک بتاؤ، بس جلدی بتاؤ! جتنا جواب دینے میں جھنجھلائے گا، اتنا ہی جلد راز افشا کر دے گا۔

اس مقدمے میں متعدد گرفتار شدگان میرے سپرد کیے گئے۔ اصرار کے اس آزمودہ گر سے تمام ملزم مجبور ہو کر رازِ دل بیان کرنے لگے۔ سب حیران تھے کہ میرے پاس کیا جادو ہے جو سر چڑھ کر بولتا ہے۔

ابھی تفتیش تشنۂ تکمیل تھی، کہ بڑے بھائی کی علالت نے اُن کی عمر کا پیمانہ لبریز کر دیا۔ ان کی موت سے میرے اثر پذیر دل پر قیامت ٹوٹ پڑی۔

انہیں دنوں فاتح اتحادیوں نے مفتوح ترکی کو خوانِ یغما سمجھ کر آپس میں بانٹا "شیرِ برطانیہ" نے حسبِ معمول سب سے بڑا حصہ حاصل کیا۔ مسلمانوں کے قلب مجروح ہو گئے عہد نامہ سیورے، مسلمانوں کی سیاسی موت پر مہرِ تصدیق تھا۔ ترک تڑپے اور ان کی تڑپ دیکھ کر انگریزی غلامی پر قانع ہندوستان کا غریب مسلمان بھی تڑپ اٹھا۔

اگرچہ میں نالائق افسر نہ تھا، تاہم انگریزی ملازمت کی ایک ساعت بھی اب میرے لیے ناقابل برداشت تھی، چنانچہ میں نے استعفا دیا تو بوجھ ہلکا ہوا۔ میں ان دنوں لدھیانہ تھانہ صدر میں تعینات تھا۔ اُسی جگہ میرا کامیاب لیکچر ہوا۔ جب میں ہاتھ لٹکاتا گھر پہنچا، تو گاؤں کے لوگوں نے میری اس حرکت پر تعجب کیا۔ کچھ لوگوں نے میرے اچانک استعفیٰ کو میری بے وقوفی پر محمول کیا۔ انہیں اس آگ کا علم نہ تھا جو ایک مدت سے میرے سینے میں سلگ رہی تھی۔ میں اُن کی سرگوشیوں سے بے پرواہ تھا۔ گاؤں کے لوگ مجھ سے ڈرنے لگے تھے کہ مبادا وہ بھی کہیں میرے ساتھ ہی سرکار کے غصے کا شکار نہ ہو جائیں! میں نے بدکے ہوئے جانور کی طرح انہیں آہستہ آہستہ رام کرنا شروع کیا۔

اس اثناء میں مجھے ہوشیار پور سے لیکچر کی دعوت موصول ہوئی۔ میں وہاں چلا گیا۔ ایک بیرسٹر کی صدارت میں تقریر کی چھتوں اور مکانوں پر بھی آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ اتفاق سے ایک شکستہ مکان کی چند اینٹیں نیچے گر گئیں جن سے ایک آدمی زخمی ہو گیا۔ اس نے واویلا مچا دیا۔ لوگ حادثۂ جلیانوالہ سے ڈرے بیٹھے تھے، سمجھے کہ گولی چل گئی۔ اب کیا تھا جلسے میں بھگدڑ پڑ گئی۔ صدرِ صاحب کو بھی یقین ہو گیا کہ فی الواقع انکے گرد و پیش گولیوں کی بارش ہو رہی ہے۔ گرمی کے دن تھے، انہوں نے ململ کا کرتا اتار کر "گولیوں" کے سامنے کر دیا تاکہ سینہ بچا رہے یہ بیرسٹر کی دماغی کیفیت کا حال تھا، تو عوام کا کیا کہنا!

دو آدمیوں نے "گولیوں" سے بچاؤ کے لیے ایک اندھے کنوئیں میں کود کر بزعم خود جان بچائی۔ ایک اور بیرسٹر ہلکی سے دھوتی پہن کر آئے تھے۔ بھاگ دوڑ میں کسی کا پاؤں دھوتی سے اُلجھ گیا۔ دھوتی وہیں رہ گئی اور آپ عالم سراسیمگی میں برہنہ بھاگے چلے جا رہے تھے کہ کہیں وسط بازار میں برہنگی کا احساس ہوا تو آگے پیچھے ہاتھ رکھ کر گھبرائے ہوئے ہرن کی طرح گھر میں داخل ہوئے۔ سینکڑوں بوٹ، جوتے، پگڑیاں اور دھوتیاں وہیں رہ گئیں۔ ضلعی حکام اور پولیس کو بڑی خوشی ہوئی، لیکن عوام الناس مدت سے مرے جاتے تھے۔

تحریک ترک موالات جوبن پر تھی۔ آزادی کے دیوانے شمع حریت پر پروانوں کی طرح گر رہے تھے۔ احباب ایک ایک کر کے "دارالامان" میں پہنچ چکے تھے۔ ملک ویران اور جیل خانے رشک جنت بن رہے تھے۔ دو برس کی مسلسل دعوت اسیری اور خواہش پابندی کے باجود میں ابھی آزاد تھا۔ اس لیے دل مغموم و ناشاد تھا۔ اپنی شکستہ پائی پر افسوس اور ہم سفروں کی منزل مقصود تک رسائی پر رشک آتا تھا۔ یکایک در اجابت کھلا اور جس گھڑی کا انتظار تھا وہ آن پہنچی میری گرفتاری قلعہ پھلور کے ایک ہم درس اور ہم جلیس سب انسپکٹر پولیس کے ہاتھوں انجام کو پہنچی، جوان دنوں تھانہ گڑھ شنکر کا افسر انچارج تھا۔

تھانے میں پہنچ کر میں نے وارنٹ دیکھنا چاہا تاکہ مقدمے کی تاریخ اور مقام سماعت کا پتا چل سکے، مگر میرے دوست سب انسپکٹر نے مجھے وہاں داخل کر دیا جہاں کچھ عرصہ پہلے میں اپنی قوت فیصلہ کو کام میں لا کر خوف زنداں سے ہراساں و لرزاں انسانوں کو بند کر دینے کا خود حکم دیا کرتا تھا۔

حوالات کے لیمپ کی مدھم روشنی سے اس جگہ حسرت سی برس رہی تھی۔ ہوا کے سرد جھونکے تلوار سے زیادہ تیز اور حوالات کے کمبل حیوانوں کی جھول سے بدتر تھے۔ منہ باہر رکھوں، تو ہوا کھائے اندر کروں، تو تعفن سے سر چکرائے وہ رات زلف یار سے زیادہ تاریک و طویل ہو گئی۔ میں اٹھ اٹھ بیٹھا اور بیٹھ بیٹھ کے اٹھا کباب سیخ کی طرح کروٹ پر کروٹ بدلی، لیکن نہ اس کل چین تھا نہ اس کل آرام غرض منتیں مان کر صبح کی۔

آفتاب عالمتاب جب جابروں کی ستم آرائیوں کو بے نقاب کرنے کے لیے نکلا، تو مجھے بھی ہتھکڑی کے زیور سے آراستہ کر کے حوالات سے نکالا گیا۔ احباب نے مجھے ہار پہنائے اور پھول برسائے۔ سپرنٹنڈنٹ پولیس، مع گارد پیدل آگے آگے اور میں تانگے پر جا رہا تھا۔ آج عبرت آسمان کی طرف دیکھ رہی تھی جس طرح کبھی میں ترقی درجات کی امید پر دوسروں کی گرفتاری پر پھولا نہ سماتا تھا، آج خود زنجیر و سلاسل میں بندھا تھا اور میرے دوسرے بھائی میری گرفتاری پر حکومت کی چشم کرم سے امید انعام لگائے بیٹھے تھے۔

ایک غیر معروف مقام پر مجسٹریٹ میری آمد کا منتظر تھا پولیس والے مجسٹریٹ کے ارد گرد پہرہ دے رہے تھے۔ وہاں پہنچتے ہی مجھے کھانا دیا گیا۔ روٹی گندم کی معلوم ہوتی تھی، مگر سالن طرفہ چیز تھی جس کو دیکھ کر جی باہر آتا تھا تھوڑی دیر بعد مجھے سماعت کے لیے بلایا گیا۔ باوجود حکام کی رازداری کے معلوم نہیں کیسے لوگوں کو معلوم ہو گیا۔ آدھ ہی گھنٹے میں عوام کا میلہ لگ گیا۔ قومی نعرے اس زور سے لگاتے اور شبد، بھجن اس انداز سے گاتے تھے کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی۔۔۔۔ نہ مجسٹریٹ گواہوں کی سن سکے نہ گواہ مجسٹریٹ کی۔ آخر مجسٹریٹ کو مجھ سے استدعا کرنی پڑی کہ اس شور محشر کو بند کرنے میں کچھ آپ مدد دیں۔۔۔ میری معروضات کو لوگوں نے توجہ سے سنا اور دور ہٹ کر خاموشی سے بیٹھ گئے۔

میرے برخلاف مقدمات زیر دفعہ ۱۷ (الف و ب) ترمیم ضابطۂ فوجداری کی سماعت شروع ہوئی۔ سرکاری گواہوں میں ایک تو وہ سب انسپکٹر تھا جس نے مجھے گرفتار کیا تھا۔ دوسرے تھانہ شہر ہوشیار پور کے افسر انچارج جن کے ساتھ تھانہ صدر لدھیانہ میں ایک جگہ اکٹھے رہنے کا اتفاق ہوا تھا۔

اول الذکر سے مؤخر الذکر میری گرفتاری سے زیادہ متاثر تھے۔ انکی شرمائی ہوئی آنکھیں اور افسردہ چہرہ ان کی

دلی کیفیت کا آئینہ دار تھا۔ عدالت کے انصاف کے متعلق شبہہ کیا جا سکتا ہے، مگر مجسٹریٹ کی شرافت میں کلام نہیں ہو سکتا۔ شہادت چند منٹوں میں ختم ہو گئی اور مجھے تحریری بیان داخل کرنے کے لیے دو دن کی مہلت دے کر ہوشیار پور جیل میں روانہ کر دیا گیا۔

جیل میں مجھے ایک کوٹھڑی میں بند کر کے تالا لگا دیا گیا۔ میں اس کوٹھڑی میں ایک قبر دیکھ کر حیران رہ گیا خیال آیا کہ یہ کسی قیدی بزرگ کی خانقاہ ہے اور فیوض وحانی سے بہرہ اندوز ہونے کا ارادہ موقع دیا گیا ہے۔ قبر پر بڑا رعب و جلال برس رہا تھا تاریکی اور سناٹے نے منظر کو اور بھی موثر بنا ڈالا تھا۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ اس بزرگ کی ابدی خواب گاہ پر ضرور برکتوں کا نزول ہو رہا ہے۔ اگر مجھے اپنے اعتقاد پر اصرار نہ ہوتا، تو ضرور سر بسجود ہو کر سوراج اور بحالی خلافت کے لیے اس بزرگ سے ملتجی ہوتا۔

میں ابھی اصرار و انکار کی کشمکش میں مبتلا تھا کہ ہیڈ وارڈر روشنی اور کمبل لے کر آیا۔ دیکھنے سے پتا چلا کہ قبر بلا تعویذ ہے گستاخ وارڈر نے کمبل قبر پر بچھا کر کہا اس پر آرام فرمایئے! وہ یہ کہہ کر چھلاوے کی طرح نکل گیا اور میرے لیے یہ معاملہ حل طلب ہی رہا۔

میری طبیعت پر ابھی ابتدائی اثر باقی تھا اور پاس ادب سے پاس کھڑا تھا کہ اتنے میں لانگری کھانا لے کر آیا۔ اس سے میں نے پوچھا: یہ کس بزرگ کی قبر ہے؟" بولا کہ آپ جیسے کسی مہاپرش کی۔ اس بے ساختہ جواب پر بلا تامل تھپڑ مارنے کو جی چاہا، مگر اصول عدم تشدد آڑے آیا۔ میں مثل آئینہ حیران کھڑا تھا کہ باہر سے کسی نے لانگری کو پکارا: "قیدی سے باتیں نہ کر، باہر آ!" وہ بھیگی بلی کی طرح خاموشی سے باہر نکل گیا۔

مجھ پر قبر کا عقدہ اب بھی نہ کھلا۔ میں دیر تک غرق حیرت رہا۔ اتنے میں مؤذن نے عشاء کی اذان دی۔ میں مولوی عنایت اللہ کی آواز پہچان کر اُچھلا۔ خاتے پر انہیں بلایا۔ ساتھ کی کوٹھڑی میں اچھل کود شروع ہوئی کہ آپ بھی آ گئے۔ معلوم ہوا کہ یہ لوگ سردار بھگت سنگھ اور وریام سنگھ ہیں۔ میں نے سب سے پہلے اس قبر کے متعلق سوال کیا، تو پتا چلا کہ یہ مٹی کا چبوترہ قیدی کا پلنگ ہے جو اپنی ظاہری بناوٹ کے سبب قبر معلوم ہوتا ہے اور عام طور پر اسے "کھڈی" پکارتے ہیں۔ مجھے اس معمے کے حل سے بڑی ہنسی آئی۔ شب گزشتہ کی بے خوابی اور کوفت سفر سے چور چور تھا اس کھڈی پر مردے کی طرح لیٹ گیا۔

صبح نے جب پھولوں کے بستر سے اٹھایا، تو میں بھی خواب گراں سے چونکا۔ آواز دی تو ساتھی ندارد۔ معلوم ہوا کہ مولوی عنایت اللہ اور وریام سنگھ دوسری جیل میں منتقل کر دیئے گئے، البتہ بھگت سنگھ باقی ہیں۔ میں دو روز تحریر بیان میں مصروف رہا کیونکہ ۱۶ فروری ۱۹۲۲ء کو عدالت میں عدل کی تماشا گری ہونی تھی۔

تاروں کی چھاؤں میں پولیس مجھے جیل سے لے کر روانہ ہوئی اس غیر معمولی کارروائی سے گمان گزرا کہ شاید اندھیرے ہی اندھیرے میں مجسٹریٹ عدالت کی کرسی کو زینت دے کر اندھیر نگری چوپٹ راجہ کا ثبوت پیش رہے گا۔ بہر حال گیارہ بجے عدالت میں عدل کا ڈراما کھیلا گیا۔ پولیس جا بجا سڑکوں پر پہرہ دے رہی تھی۔ عدالت میں آنے کی کسی کو مجال نہ تھی۔ بدقت تمام چند وکلاء اور دو نامہ نگار اندر آ سکے۔ مجسٹریٹ نے کہا کہ بیان دیجئے میں نے کہا کہ پولیس کا لیجئے جو رات ہی رات مجھے جیل سے لے آئی اور ترتیب بیان کا موقع نہیں دیا۔